بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اسلام اور مذاہب کا حال و مستقبل

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

جدید سائنسی تحقیقات میں مصنوعی ذہانت (Artifical Intelligence) نے جسے AI بھی کہا جاتا ہے، گذشتہ چند برسوں میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ تقریباً ہر روز علمی اُفق پر مصنوعی ذہانت کے معیشت، معاشرت، عالمی دفاع، فرد اور معاشرے پر اثرات کے تعلق سے موضوعات زیر بحث لائے جارہے ہیں۔ علمی و تحقیقی حلقوں میں چیٹ جی پی ٹی (Chat GPT) کے عمل دخل کی بنا پر پیدا ہونے والے اخلاقی سوالات ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی عقل اور تحقیق اس مقام تک پہنچنے لگی ہے جہاں فرعون اور نمرود کی پیروی کرتے ہوئے سائنس خود اپنے ربّ ہونے اور جدید دجّال کی طرح زندگی اور موت پر قابو کا عملاً اعلان کرنے کے لیے آمادہ ہو۔

تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے عالمی حالات اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے پس منظر میں گذشتہ ربع صدی میں عالم گیر سطح پر بعض جائزے یہ شواہد فراہم کر رہے ہیں کہ جرمن مفکّر نیٹشے کے یہ لکھنے کے باوجود کہ عیسائیت کے خدا کی (نعوذ باللہ) موت واقع ہوچکی ہے اور جس کے نتیجے میں امریکن اکیڈمی آف ریلجنز کے سالانہ علمی اجتماعات میں ایک سے زائد فکری حلقوں میں Death of God Theology کے موضوع پر مختلف مقالات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں گیلپ انٹرنیشنل نے ایک عالمی جائزہ لیا (سروے کیا)، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام کے بڑھتے ہوئے 'خطرے' کے پیش نظر یہ دیکھا جائے کہ مختلف مسلم ممالک اور غیر مسلم دُنیا اور علاقوں میں کیا رجحانات پائے جاتے ہیں اور اسلام سے خائف یورپ اور امریکا کس طرح اپنا دفاع کر سکتے ہیں؟

اس جائزے میں یہ بات اُبھر کر سامنے آئی کہ ایسے ممالک میں بھی جہاں ظلم و استبداد،

عسکری تسلط اور اسلام دشمن قوتیں یا کم از کم لادینیت (Secularism) کے حمایتی برسر اقتدار ہیں، ان ممالک میں بھی ۶۰ فی صد یا زائد مسلمان اسلامی شریعت کو اپنے مسائل کا حل اور آمریت اور مغربی لادینیت کے مقابلے میں اسلامی احیا کو اپنی ترجیح قرار دیتے ہیں۔ اس تحقیق کے مرتب اور اسلامیات پر گہری نگاہ رکھنے والے پروفیسر جان ایل اسپوسیٹو کے تجزیے کے مطابق مشرق وسطیٰ کے مسلم اکثریتی ممالک کے ایسے مرد و خواتین جنھیں مغرب زدہ یا Moderate سمجھا جاتا ہے، ان کے ۸۳ فی صد نے اسلامی شریعت کے حق میں رائے دی۔ جب کہ وہ معاشرتی گروہ جو اسلامی انقلابی (Politicaly radical) کہلاتے ہیں، ان سے تعلق رکھنے والے ۹۱ فی صد افراد کی نگاہ میں شریعت پر مبنی نظام ہی ان کے مسائل کا حل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ اسلام کا مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ مصر اور سعودی عرب میں بالترتیب ۹۰ فی صد اور ۹۱ فی صد مرد اور عورت دونوں کا خیال تھا کہ اسلام انھیں روحانی سکون عطا کرتا ہے، زندگی کے مقصد سے آگاہ کرتا ہے اور زندگی کو بامعنی بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

نماز کی ادائیگی اور اس کے اثرات کے بارے میں ۲۰۰۱ء میں گیلپ ہی کے ایک تجزیے کے مطابق چھے ممالک کی دوتہائی آبادی کے تاثرات پر مبنی جائزے میں مراکش میں ۸۳ فی صد پاکستان اور انڈونیشیا میں ۷۹ فی صد، کویت میں ۷۴ فی صد، انڈونیشیا میں ۶۹ فی صد، لبنان اور ایران میں ۶۸ فی صد مرد و خواتین نے یہ اقرار کیا کہ ''نماز انھیں اپنے ذاتی مسائل کے حل میں مدد اور تسکین فراہم کرتی ہے اور روزہ اللہ رب العزت کے دروازہ تک اور صدقہ ہمارے جنت میں داخلے کا ذریعہ بنتے ہیں''۔

گیلپ انٹرنیشنل کے حالیہ علمی جائزے ۲۰۲۳ء میں خدا کے وجود، آخرت پر یقین، جنت اور جہنم پر ایمان کے نکات پر دُنیا کی تقریباً دوتہائی آبادی سے حاصل کردہ معلومات تمام اہل دانش کے لیے قابلِ غور ہیں، خصوصاً ایسے افراد جو اقامت دین کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں، ان کے لیے اس جائزے میں غور و فکر کے کئی عنوانات موجود ہیں۔

خدا کے وجود اور اپنے تشخص کے بارے میں عالمی سطح پر ۶۲ فی صد افراد اپنا تشخص مذہبی ہونا بتاتے ہیں، جب کہ ۷۲ فی صد خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا کی آبادی کے دوتہائی افراد

میں سے ۵۷ فی صد حیات بعد موت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۵۹ فی صد افراد جنت کے وجود پر اور ۵۳ فی صد جہنم کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔

ان اعداد و شمار کا مقابلہ ۲۰۱۳ء کے جائزے سے کیا جائے تو امریکا میں ۵۶ فی صد افراد خود کو مذہبی سمجھتے تھے، جب کہ روس میں ۷۰ فی صد اپنے مذہبی ہونے کا اقرار کرتے تھے۔ ۲۰۲۳ء میں امریکا میں اس رجحان میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ ۶۰ فی صد افراد خود کو مذہبی قرار دیتے ہیں لیکن روس میں ۲۰۲۳ء میں اس رجحان میں کمی ہوئی اور وہاں آج ۷۰ فی صد کے مقابلے میں ۶۲ فی صد اپنے آپ کو مذہبی سمجھتے ہیں۔

۲۰۲۳ء کے اعداد و شمار کی روشنی میں میں دنیا کی آبادی کے دو تہائی حصّے میں سے ۱۰ فی صد خود کو دہریہ (Atheist) قرار دیتے ہیں، جب کہ ۲۰۱۳ء میں یہ شرح ۹ فی صد تھی۔ گویا اس جائزے کے مطابق دہریت میں ایک فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اگر صرف مسلم ممالک کو دیکھا جائے تو خدا کے وجود پر مسلم ممالک میں سو فیصد اور غیر مسلم ممالک جہاں مسلمان آبادی قلیل تعداد میں ہے، ۱۷ ممالک میں ۹۰ فی صد یا اس سے کچھ کم درجہ رکھنے والے افراد ۹۰ تا ۹۹ فی صد خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں، جب کہ مسلم اکثریتی ممالک میں یہ تناسب ۱۰۰ فی صد یا اس کے لگ بھگ ہے۔

دنیا کے دو سو سے زائد ممالک پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے تو دہریت میں ایک فی صد اضافہ ہوا ہے، لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ، آخرت، جنت اور جہنم پر یقین کو دیکھا جائے تو مسلم ممالک دیگر ممالک سے بہت آگے ہیں، اور ۱۰۰ فی صد یا اس کے لگ بھگ آبادی میں دہریت سے دُوری اور اور مذہب سے وابستگی کا اظہار موجود ہے۔ اگرچہ عالمی سطح پر ایک فی صد دہریت میں اضافہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عالمی سطح پر دینی معلومات میں کمی ہے اور ایسے طبقات تک دعوت کا مؤثر ابلاغ نہ ہو سکا جس کی بے پناہ ضرورت ہے۔

زمینی حقائق کے اس جائزے سے بظاہر یہ عمومی تاثر ہمارے ذہن میں اُبھرتا ہے کہ ''تمام تر دہریت (Atheism) اور لادینیت (Secularity) اور مادہ پرستی (Materialism) کے باوجود، لوگوں کی ایک معقول تعداد عیسائیت، اسلام، ہندو ازم اور بودھ ازم کے تناظر میں اپنے آپ کو مذہب سے وابستہ کرتی ہے اور دنیا کی مکمل آبادی میں بہ مشکل ۱۰ فی صد افراد ہیں جو

الحاد میں اپنی نجات سمجھتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ۱۰ فی صد افراد عالمی معیشت، سیاست، ثقافت، تعلیم اور دفاعی معاملات میں کتنا مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں اور جو اکثریت اپنے آپ کو 'مذہبی' کہتی ہے معاشرہ اور عالمی حالات پر اس کا کتنا اثر (impact) ہے؟

یہ بات جانی پہچانی ہے کہ تمام معروضیت کے باوجود کسی بھی عددی جائزے میں جو سوالات مرتب کیے جاتے ہیں، انھی سے دیگ کے چند چاولوں کی بنیاد پر کھانے کے قابلِ طعام ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے ۔ نتائج بڑی حد تک مختلف عوامل سے متاثر ہوتے ہیں ۔ لیکن اگر چند لمحات کے لیے یہ مان لیا جائے کہ تجزیے میں دنیا کی دو تہائی آبادی سے سوالات و استفسارات سے جو مواد حاصل ہوا ہے، وہ معتبر ہے اور بڑی حد تک مذہب، خدا اور انسانی زندگی پر ان اثرات کے حوالے سے جو اعداد و شمار ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ زمینی حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں، تو بآسانی یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ مختلف اسباب اور عوامل کے نتیجے کے طور پر عالمی سطح پر الحاد میں لازماً اضافہ ہوا ہے۔ دوسری جانب بعض مذاہب نے ان علاقوں میں جہاں پہلے ان کا اثر کم تھا، وہاں اپنی پہنچ میں اضافہ کیا ہے اور بعض مذاہب باوجود اپنی اعلیٰ صلاحیت کے وقت کے مطالبات کے معقول حل پیش کرنے میں دوسروں سے پیچھے ہیں۔

پیش نظر مسئلے کا تقابلِ ادیان کے زاویے سے جائزہ لیں تو خصوصاً افریقا میں ۱۹۷۰ء میں عیسائی چرچ نے باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کے ذریعے عالمی سطح پر عیسائیت کی ترویج کے لیے وسائل مہیا کیے تھے، جس کے اثرات ربع صدی کے بعد ظاہر ہوئے اور سروے میں اس کا ثبوت عیسائیت کے فروغ کی شکل میں موجود ہے۔ بہرحال فی الوقت ہمارے پیش نظر صرف اسلام کے حوالے سے چند بنیادی اُمور پر غور کرنا ہے۔

دین کی بنیادوں سے لاعلمی

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے وجود یا آخرت کے واقع ہونے اور جنت اور جہنم پر ایمان کا تعلق ہے، مسلمانوں کے انتہائی زوال کے دور میں بھی ایک پیدایشی یا ثقافتی مسلمان بھی جنت اور جہنم کے حقیقت ہونے کا قائل تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ذاتی زندگی اس عقیدے سے کتنی مطابقت رکھتی تھی۔ اللہ کے وجود اور دنیا میں کیے جانے والے اعمال کے لیے ایک امتحان گاہ کو نہ صرف

عقلی ضرورت بلکہ اپنے وجود سے وابستہ سمجھتا تھا، لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ برصغیر جنوب مشرقی ایشیا میں ہمارے دینی عقائد میں بیرونی تصورات غیر شعوری یا شعوری طور پر داخل ہوتے گئے جس کا سبب برصغیر میں غیر اسلامی خصوصاً ہندومت کے بہت سے طریقوں کا روایتی مسلم معاشرے میں نفوذ کر جانا ہے۔ ان بہت سی رسومات کو جو بنیادی دینی تعلیمات سے عدم آگاہی کی بنا پر رواج پا گئیں، روحانیت اور قرب الٰہی کے نام پر رواج دیا گیا۔ میر تقی میر نے ڈھائی صدی قبل اس مسئلے کا اظہار یوں کیا تھا ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا ، دَیر میں بیٹھا ،کب کا ترکِ اسلام کیا

دوسری جانب جنت اور جہنم کے وجود پر ایمان لاتے ہوئے ایک ایسے ذہین شاعر نے جو اپنے آپ کو نصف مسلمان اس لیے کہتا تھا کہ حرام مشروب کے استعمال کے باوجود کبھی حرام گوشت کی طرف نہیں گیا، جنت اور جہنم کے وجود پر اپنے ایمان کو یوں بیان کیا ہے کہ ؎

کیوں نہ جنت کو جہنم سے ملادیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی جگہ اور سہی

گویا مسلم معاشرتی شعور میں روح کی گہرائیوں اور ذہن کی وسعتوں میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ملتا، جہاں عملاً دین کے بعض ارکان کو ترک کرنے کے باوجود ایک مسلمان، چاہے وہ محض پیدائشی اور ثقافتی طور پر مسلمان ہو، بنیادی تعلیمات سے واقفیت اور آگاہی کے ساتھ ان پر یقین رکھتا تھا۔ ان کے ہاں دین کا جامع تصور مفقود نظر آتا ہے۔ اگر جدید جائزوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دین کی بنیادی تعلیمات سے لاعلمی آج تک ایک تلخ زمینی حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ اس رجحان کے اسباب اور ان کا ممکنہ حل کیا ہو؟ یہ تحریکات اسلامی کے لیے ایک اہم غور طلب امر اور چیلنج ہے۔

تعلیم و تربیت

معاشرتی رجحانات کے بننے اور بگڑنے میں تربیت، ماحول اور تعلیم کا کردار فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ مذکورہ جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلم اکثریتی ممالک میں بھی اسلام سے جذباتی وابستگی پائی جاتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور ایک اطمینان بخش صورتِ حال ہے، لیکن وہاں بھی اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو پرائیوٹ تعلیمی اداروں سے فراغت پانے والی نئی نسل اے لیول

اور او لیول اور سیکولر کلچر اور نصاب کے سائے میں پرورش پا کر فارغ التحصیل ہو رہی ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے طلبہ و طالبات بھی دین کے بارے میں محض رسمی معلومات سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ تحریک اسلامی کے لیے یہ صورت حال خاص طور قابل غور ہے اور فوری اقدام کی متقاضی ہے۔ مملکت خداداد پاکستان میں ۷۵ سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود، ہر حکومت کے دور میں زبانی جمع خرچ تو ہوا لیکن خاطر خواہ طریقے سے نصابی تبدیلی اور نصاب کے ساتھ بنیادی دینی معلومات فراہم کرنے والی کتب، اساتذہ اور ماحول فراہم نہیں کیا جاسکا۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ جن اداروں میں تحریک اسلامی سے وابستہ افراد پائے جاتے ہیں، کیا وہاں تعلیم و تربیت سے متعلق منظم اور مستقل اقدامات کیے جارہے ہیں؟ اور جہاں تحریکی افراد کے اپنے ادارے ہیں، ان میں ملک گیر پیمانے پر کیا تجربات کیے گئے ہیں؟ اور ان کے نتائج کا تجزیہ کرنے کے بعد آیندہ کے لیے کیا لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے؟ اس پر بلاکسی تاخیر جائزہ لینے کی ضرورت ہے تاکہ ضرورت کے تعین (Need Analysis) کے ذریعے ایک قابلِ عمل حکمت عملی کا نفاذ کیا جاسکے۔

زمینی حقائق کچھ یوں ہیں: گھر جو سب سے پہلی تربیت گاہ یا مدرسہ ہے اور جو دینی اور تہذیبی اقدار کا آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا فطری ذریعہ ہے، اس گھر کو ہم نے شعوری یا لاشعوری طور پر جدید الیکٹرانک سمعی اور بصری آلات کی رنگینی کے حوالے کر دیا ہے۔ ایک تین سالہ بچہ بھی ڈزنی کی دنیا کا شہری بن گیا ہے اور اپنے والدین کی دنیا سے کٹ کر اپنے احساسات، زندگی کے مقصد اور مثالی طرزِ عمل کے لیے ان کارٹون کرداروں کا مرہونِ منت ہوگیا ہے، جو ڈزنی نے لادینیت، عریانیت، نفس پرستی، اَنانیت اور اپنی ذات کی نمائش اور پرستش کے اصولوں پر نوعمر ذہنوں اور ان کی روح میں اُتر جانے کے لیے ایجاد کیے۔ یہ رجحان مثبت متبادل مواد کی فراہمی کے بغیر تبدیل نہیں ہوسکتا۔

ذہنی غلامی اور مرعوبیت

دوسرا اہم سبب مسلمانوں کے ایک اہم اور مؤثر حصّے کا ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو جانا اور ہر معاملے میں اعلیٰ معیار کے لیے صرف اور صرف مغرب کی طرف دیکھنے کو اختیار کرنا ہے۔ وہ موزہ ہو، قلم، قمیص، جوتا، غسل خانے میں لگنے والی ٹونٹی ہو یا عمرانیات، طب، ریاضی یا دیگر علوم، ہر شعبے میں اعلیٰ معیار (state of the art) مغرب کو قرار دے کر لادینیت پر مبنی علمی روایت کو پوری

مسلم دنیا نے پورے عقیدت و احترام کے ساتھ اختیار کر لیا۔ اس ذہنی مرعوبیت کے نتیجے میں گفتگو ہو یا تحریر، ہر میدان میں مغربی جدیدیت کو علمیت کے ثبوت کی شکل میں اختیار کر لیا گیا، جس کے نتیجے میں مغرب سے درآمد کردہ اصطلاحات کا استعمال دانش وری کی علامت اور علمیت کی دلیل سمجھا جانے لگا۔ ان اصطلاحات کے پیچھے جو تصورات ہمارے ذہنوں میں گھر کر رہے ہیں، حتیٰ کہ اپنی ثقافت کے مطابق لباس پہننا اور اپنی زبان میں اظہار خیال کرنا بھی معاشرے میں ایک معیوب عمل سمجھا جانے لگا۔

تعلیم و تربیت کا شعبہ دور جدید میں عددی ابلاغ عامہ (Digital Media) کا تابع ہو چکا ہے۔ جس تیزی کے ساتھ برقی ذرائع کا استعمال، تعلیم، تفریح اور ابلاغ عامہ میں ہو رہا ہے، اس میں صرف چند قرآنی قصوں پر مبنی کتابچے کام نہیں کر سکتے۔ اگر ہم صرف ہم خیال تعلیمی اداروں کی ضروریات کا جائزہ لیں تو معاشی طور پر ایسی چیزیں جو تربیتی زاویے سے برقی ذرائع میں تیار کی جاسکیں، مارکیٹ میں اپنا مقام پیدا کریں گی۔ شرط یہ ہے کہ اس مواد میں تعلیمی نفسیات اور نصابی کتب کے مطالبات کو فنی مہارت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یہ کام جہاں حکومتی دائرے میں کرنا ضروری ہے، وہیں کسی حکومتی اختیار کے بغیر بھی ہوسکتا ہے اور کامیابی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

ایسے ہی اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ضروریات کے پیش نظر ایسے مواد کی تیاری جو اخلاق، سیرتِ پاک، قرآنی تعلیمات اور فنی معلومات کو یکجا کرتا ہو، آج کی بنیادی کی ضرورت ہے۔ دینی فہم، دینی تعلق اور دینی جذبات کا پیدا کرنا تحریک کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ یہ کام محض بیانات اور تبدیلی کے نعروں سے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے قابلِ محسوس اعلیٰ فنی معیار کے مواد کی ضرورت ہے، جس کی برتری کا اعتراف مخالفین کو بھی کرنا پڑے۔

اس غلامی سے نکلنے کے لیے چند اہم اقدامات ضروری ہیں۔ اولاً: مغربی فکر سے واقفیت کے ساتھ اس کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے، جس طرح کا کام مولانا مودودی نے تنقیحات، تفہیمات، رسائل و مسائل اور دیگر تحریرات میں کیا ہے تاکہ اس زہر کو سمجھا جاسکے۔ دو سو سال اور خصوصاً ۷۵ سالہ پاکستانی دور میں ہر درس گاہ میں یہ زہر پھیلایا جاتا رہا ہے۔ اس غرض سے مولانا مودودی کی ان تمام تحریرات کو بغور کئی کئی بار پڑھنے اور ان سے قابلِ عمل نکات اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا مودودی کے علاوہ بھی دیگر اہل فکر کی تحریرات کو زیر بحث لا کر نہ صرف استعماریت کے اثرات کو کم کرنے (decolonization) بلکہ اسلامی اخلاقی اصولوں کو تعلیم و تربیت کے نظام اور نصاب میں سمونے اور مختلف علوم کی تدوینِ جدید کے لیے عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ یہ کام کسی کمیٹی کے ہاتھوں نہیں ہوگا۔ اس میں ماہرین تعلیم جو تحریکی شعور اور براہِ راست قرآن و سنت اور مسلمانوں کی تاریخ سے آگاہی رکھتے ہوں، ان کی ہمہ وقت شرکت ضروری ہوگی۔ اس کام کو واضح نقشۂ کار اور وقت کے تعین کے ساتھ کرنا ہوگا، تاکہ مقررہ مدت میں نتائج سامنے آسکیں۔ یہ کام بغیر کسی بڑے مالی بوجھ کے ہوسکتا ہے۔ پروفیسر سیّد محمد سلیم مرحوم نے بغیر ماہرین کی کسی ٹیم کے، بہت سے علمی کام کیے۔ یہ کام آج بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام طویل عرصہ سے مؤخر ہوتا چلا آرہا ہے۔ اب اس کام میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس قابلِ عمل کام کے لیے قوتِ فیصلہ، ارادے کی پختگی، اجتماعی مشاورت اور آغاز کی ضرورت ہے۔

دین اور دنیا میں تفریق

تیسرا اہم سبب جو دوسرے سبب سے وابستہ ہے دین اور دنیا میں تفریق کا بیرونی اور غیر اسلوبی تصور ہے، جسے دینی اور غیر دینی دونوں طبقات میں بااثر افراد نے نہ صرف قبول کرلیا بلکہ اس کی بنیاد پر زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ عبادات کا اہتمام اللہ تعالیٰ کا حق قرار پایا اور سیاست، تعلیم، معاشرت، ثقافت وغیرہ میں مرغ بادِنما کی طرح زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنے کا طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔

اس ذہنی پس منظر میں دنیا کو ترجیح دینا اور دین کو محض مذہبی رسومات یا تہواروں تک محدود کرنا ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ رسمی مذہبیت ہی کو اسلام سمجھ بیٹھا۔ قرآن و سنت سے لاعلمی اور پیری مریدی کے ذریعے نجات حاصل کرنا، جاہل عوام کا نہیں مغربی تعلیم یافتہ اور مغرب پلٹ دانش وروں کا بھی مسلک بن گیا۔ خود دینی فکر کے حامل طبقات بھی اس دورُخی کو عملاً اختیار کرنے کے سبب زندگی کے دو خانوں پر اظہارِ خیال کرتے رہے اور چند علما اور اہل فکر کو چھوڑ کر دین داری اور دنیاداری دونوں کی آمیزش کو اچھی 'مسلمانیت' سمجھ لیا گیا۔

ان حالات میں سیّدابوالاعلیٰ مودودی نے براہ راست قرآن و سنت پر مبنی تصورِ دین کو

متعارف کرانے کا فریضہ سرانجام دیا اور ان کے انقلابی لٹریچر نے مسلم دُنیا ہی نہیں پوری عالمی سطح پر اسلام کے ایک مکمل نظامِ زندگی ہونے اور مسلم اُمت کے مقصد وجود کو اقامت دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا میدانِ عمل مقرر فرمایا، جس کی بازگشت ساری دُنیا میں سنی جاسکتی ہے۔ اسی طرح علامہ محمد اقبال نے توحید کی وضاحت کرتے ہوئے دین کی ہمہ گیریت اور دین و سیاست کی تفریق کو اپنے شعر اور خطبات کے ذریعے مغربی تعلیم یافتہ افراد تک پہنچایا۔ اور 'جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی' کی آواز بلند کی۔

آج پہلے سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ علامہ اقبال اور مولانا مودودی کی طرح تجدیدِفکر کے کام کو بنیادی اہمیت دی جائے اور چار سطح پر دین کی بنیادی تعلیمات کو متعارف کروایا جائے۔ اول: لادینیت اور دہریت پر اعلیٰ تنقیدی، غیر معذرت پسندانہ انداز میں انگریزی اور اردو میں سلسلۂ مضامین کو پڑھے لکھے افراد تک پہنچایا جائے۔ دوم: دین کے جامع تصور کے پیش نظر ابلاغ عامہ اور سوشل میڈیا پر اسلام اور لادینیت اور دہریت پر علمی تبادلۂ خیال کے لیے ہر ماہ دو نشستیں منعقد کی جائیں۔ اس نوع کی نشستوں میں شرکا بھرپور تیاری کے ساتھ شریک ہوں، نیز ایسی نشستوں میں موضوعات کے ایسے ایک یا دو ماہرین کو شامل کیا جائے جو ان موضوعات پر مہارت رکھتے ہوں اور علمی حلقوں میں پہچانے جاتے ہوں۔

اس علمی سلسلے کو بہترین حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھایا جائے، اور اس عمل میں تحریک اسلامی سے باہر کے ایسے افراد کو بھی شامل کیا جائے جو موضوع سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اس عمل کو بہ تدریج آگے بڑھانے سے تحریک کے اندر اور باہر سے اہم علمی موضوعات پر مضبوط اور یکساں آواز بلند کرنے میں مدد ملے گی۔ ثالثاً: تحریک سے وابستہ نوجوانوں کے لیے منصوبہ بندی کے تحت ماہانہ مطالعاتی حلقے (Study Circles) منعقد کیے جائیں جن میں نہ صرف مولانا مودودی بلکہ دیگر علما اور مغرب کے معروف نمایندہ افراد کی فکر کو براہ راست مطالعہ میں لایا جاسکے۔ اس مشق سے نوجوانوں میں عصری موضوعات کو سمجھنے اور مولانا مودودی کی پیش کردہ اسلامی فکر کی روشنی میں جدید نظریات کے محاکے اور علمی دانش میں اضافہ اور گفتگو کی صلاحیت پروان چڑھ سکے گی۔

ان خطوط پر تعمیر سیرت و کردار کے ذریعے ایک نئی باشعور مسلمان نسل کو دورِ جدید کے دہریت،

الحاد اور لادینیت کی یلغار کا مثبت طور پر مقابلہ کرنے کے قابل بنایا جائے۔ یہ کام اسلام کے قرآنی اور سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی تصور کی روشنی میں قابلِ فہم ابلاغ کے ذریعے انجام پائے گا۔

اہل علم کی ذمہ داری

قرآنِ کریم اہلِ علم اور لاعلم افراد میں نمایاں فرق کرتا ہے اور حصولِ علم کو تفہیم دین کے لیے ایک اہم فریضہ قرار دیتا ہے۔ پہلی وحی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ پڑھنا اور قلم کا استعمال کرنا دعوت دین و تفہیم دین کا زینہ ہے:

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ (العلق ۹۶: ۴-۵) جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ پہلے آگاہ نہ تھا تاکہ وہ اس علم کو قول و عمل دونوں ذرائع سے دوسروں تک پہنچا سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ سے قبل تمام انبیاؑ کے مبعوث کیے جانے کے مقاصد میں تعلیم، تذکیر، تزکیہ کو بنیادی مقام دیا گیا ہے۔ اور یہ امر بھی نبوت کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ دین سربلند ہو اور بالآخر غالب ہو کر رہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۶۴) درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اُس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کا تزکیہ کرتا ہے (سنوارتا ہے) اور ان کو کتاب اور دانائی (حکمت) کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

ہر صاحبِ ایمان کو بلاتفریق جنس اور عمر یہ دعا سکھائی گئی تاکہ ان میں اللہ کی خشیت میں اضافہ ہو، گویا علم اللہ کی خشیت پیدا کرتا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (الفاطر ۳۵:۲۸) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔

اہل علم سے سوالات کے ذریعے دین کا علم حاصل کرنا ایمان کی صفت قرار دیا گیا:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (النحل ۱۶:۴۳) سو، اگر تمھیں معلوم نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔

اس حوالے سے جامعات میں نہ صرف معاشرتی علوم بلکہ اطلاقی علوم کے اُن ماہرین کو تلاش کیا جائے، جو تحریک سے وابستگی نہ ہونے کے باوجود اپنے شعبے میں مہارت رکھتے ہوں، نیز بنیادی اخلاق پر عمل پیرا ہوں۔ ایسے افراد ہر جگہ موجود ہیں۔ صرف ان تک رسائی اور انھیں تحریک دے کر ایک علمی تربیتی ماحول سے وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ افراد جامعات میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی، اساتذہ کے احترام میں کمی، علم کو محض مالی فائدہ کے لیے استعمال کرنے اور مغرب سے مرعوبیت کے رجحانات کو اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے مثبت طور پر غالب کرنے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔ یہ کام تحریک سے وابستہ افراد سب سے بہتر کرسکتے ہیں۔ مسئلہ صرف ترجیحات کی درستی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مولانا مودودی نے تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت کو اولیت دی۔ اس کے ساتھ اسلامی فکر اور احکام کے ذریعے معاشرے میں امن و انصاف کے نظام کے قیام کا حکم دیا گیا ہے (لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ الحدید ۵۷:۲۵)۔ تحریک میں جب تک ان امور کو ترجیح نہیں دی جائے گی، اس وقت تک تعلیم و تحقیق کے متحرک ادارے وجود میں نہیں آسکیں گے اور اسلامی بنیادوں پر تبدیلی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

اجتماعی تحریکی ذمہ داری

نہ صرف اہل علم بلکہ ہر مسلمان پر بلاتفریق جنس اور عمر اور خصوصاً ان باشعور افراد پر جو دین کی بنیاد پر اپنے آپ کو ایک تحریک سے وابستہ کریں، یہ فریضہ عائد کر دیا گیا کہ وہ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ بن کر اپنے عمل اور علم کے ذریعے اسلام کی عالم گیر تعلیمات کے نفاذ کے لیے استقامت کے ساتھ ہر ممکنہ ذریعے سے جدوجہد کریں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (البقرہ ۲:۱۴۳) اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'اُمت وسط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اس فریضہ کو مزید وضاحت سے اس گروہِ اہل ایمان کے سپرد کر دیا گیا جو اعلائے کلمۃ الحق کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہو:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۴) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے، وہی فلاح پائیں گے۔

اتنی واضح ہدایات کے بعد اگر معاشرے میں دین کی بنیادی تعلیمات و عقائد سے لاعلمی پائی جائے، تو اس کی بڑی ذمہ داری اس گروہ پر ہے جو دین کی بنیاد پر منظم ہوا ہو۔ گویا دین کی تفہیم اور بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت سے آگاہی کے ساتھ اپنے معاملات کو کھرا، سچا اور اپنی دعوتِ حق کا نمایندہ بنا کر ہی کوئی اسلامی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے۔ تحریک سے وابستہ افراد کو توازن، نرم گفتاری اور مخالفین کے لیے بھی عدل و انصاف کے رویوں کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے۔ قرآن تقاضا کرتا ہے کہ ہم ذات برادری، شخصیات، نسلی، لسانی، تنظیمی، سیاسی تعصّبات سے بالاتر ہوکر ہر طرح کے ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف حکمت اور جرأت کے ساتھ آواز بلند کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ (النساء ۴: ۱۳۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علَم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو، اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ زبان سے ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف دعوے کرنا اور عملاً معاشرے میں رونما ہونے والے مختلف سماجی و سیاسی ظلم اور ناانصافی کے واقعات پر خاموشی اختیار کرنا، قول و فعل کے تضاد کے مترادف ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ (الصف ۶۱: ۲-۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔

قرآن کریم نے ایک ایسی جماعت کی ضرورت پر زور دیا ہے جو قول و فعل میں یکساں ہو اور مسلسل دعوت و اصلاح کا جامع کام کرے۔ وہ جماعت قرآنی حکم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی بجاآوری کے لیے مسلسل متحرک ہو اور منظم انداز میں حکمت اور تدبر کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھائے۔

تحریک اسلامی اس فریضے کی ادائیگی کے لیے کسی اور گروہ کے مقابلے میں زیادہ جواب دہ ہے۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا تحریک آج کے دور کی زبان میں نوجوان نسل کے لیے دین یعنی قرآن و سنت کے پیغام اور اس کی تفہیم کے کام کو ترجیحی بنیاد پر کر رہی ہے؟ اگر وہ معاشرتی اصلاح، معاشی اصلاح، اور اداروں کی اصلاح چاہتی ہے، تو کیا ترجیحات میں سب سے اول ترجیح دعوت الی اللہ ہے یا بعض عصری مطالبات اسے مشغول رکھے ہوئے ہیں؟ جس کے منفی اثرات بنیادی دعوتی کام پر پڑ رہے ہیں۔

دستور کی اسلامی دفعات پر عمل درآمد کی جدوجہد

ایک مسلم ملک میں جس کا دستور اس کی عدلیہ، مقننہ، ریاست اور تعلیمی اداروں کو اس بات کا پابند کرتا ہو کہ وہ اپنے عوام کو قرآن کریم کی تعلیمات سے آگاہ کرے، ملک میں قرآن و سنت کے نظام معیشت، معاشرت، صحافت، ابلاغ عامہ، تعلیم، عدلیہ غرض ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات کو نافذ کرے۔ دیکھنا ہوگا کہ دستور کی اس شق پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں ـــــ اگر نہیں تو اس کے لیے کون سے دیگر دستوری ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت ہے؟ جمہوری روایات پر عمل کرتے ہوئے ریاست ملک کی ۹۷ فی صد مسلم آبادی کی دستوری ضرورت کو پورا کر رہی ہے یا ۳ فی صد اقلیتی آبادی کی خوشنودی کے لیے ۹۷ فی صد اکثریت کے قرآن و سنت سے آگاہی کے حق کو نظرانداز کیا جا رہا ہے؟

چار سالہ ڈگری پروگرام میں سرکاری تعلیمی اداروں میں محض دو کریڈٹ گھنٹے یعنی ہفتہ میں ایک مرتبہ یا اس سے بھی کم 'اسلامیات' کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں معاشرتی علوم یا دیگر تجرباتی علوم جن کی بنیاد میں لادینی فکر موجود ہے، وہ ۱۲۵ تا ۱۳۰ تعلیمی گھنٹوں میں روزانہ کی بنیاد پر پڑھائے جا رہے ہیں، کیا اس طرح ریاست نوجوان نسل کو قرآنی پیغام سے آگاہی کی

دستوری ذمہ داری سے سبک دوش ہوسکتی ہے؟ اور کیا تحریک سے وابستہ افراد بھی اس کا احساس رکھتے ہیں اور اس پر کیا اقدامات کر رہے ہیں؟

قرآن کریم اسلامی ریاست کو (جو دستوری طور پر پاکستان ہے) اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اسلام کے معاشی نظام (زکوٰۃ) اور نظام عبادات (صلوٰۃ) کو حکومتی اختیارات کے ذریعے نافذ کرے۔ کیا اس آئینی و دستوری تقاضے کی تکمیل کے لیے ہم ریاست کو اس کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی طرف مسلسل متوجہ کر رہے ہیں؟ آئین کی اسلامی دفعات پر عمل درآمد کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام دینی جماعتوں اور جدید تعلیم یافتہ دینی طور پر باشعور اور متحرک افراد کے ساتھ مسلسل مشاورت اور مکالمہ کے عمل کے ذریعے دستور کی اسلامی دفعات پر عمل درآمد کی راہیں تلاش کی جائیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۴۱ (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز (کا نظام) قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے (حلال معیشت کے قیام کے ذریعے)، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں قرآن کریم نے یہ بات دوٹوک انداز میں واضح کر دی ہے کہ اہل ایمان میں سے جس گروہ کو بھی زمین میں اقتدار دیا جائے، تو وہ نہ صرف اسلام کے نظام عبادات (نماز اور زکوٰۃ کے نظام کا قیام) پر اس کی روح کے مطابق عامل ہوگا بلکہ معاشرے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے بھلائی، پاکیزگی، حیا کی اشاعت وقیام اور بے حیائی، عریانی وفحاشی، بدگوئی، جھوٹ، الزام تراشی، منکر اور برائی کے تمام مظاہر کو حکومتی اور اداراتی اختیارات کے ذریعے ختم کرے گا۔ دوسری جانب محض ریاستی اور اجتماعی ہی نہیں بلکہ انفرادی سطح پر ہر فرد اپنے گھر کا سربراہ ہے اور اہل خانہ کے امور کا نگران ہے۔ علاوہ ازیں جو فرد کسی ادارے، دفتر یا کسی بھی سطح کا ذمہ دار ہے، تو اس کی ذمہ داری بھی ایسی ہی ہے جیسا کہ حکومت عوام کے معاملات کی ذمہ دار ہے۔ اسی طرح وہ فرد بھی اپنے گھر، دفتر، ادارہ و دیگر کے بارے میں اللہ ربّ العزت کے سامنے جواب دہ ہے۔

اسی بات کو حدیث مبارکہ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "تم میں سے ہر آدمی ذمہ دار ہے اور ہر آدمی اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ چنانچہ امیر ذمہ دار ہے، مرد اپنے گھر والوں پر ذمہ دار ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر ذمہ دار ہے۔ اس طرح تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ (صحیح، متفق علیہ)

اس غرض کے لیے ایک طویل المیعاد اور قلیل المیعاد حکمت عملی وضع کرنے اور اس پر کام کا آغاز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جو ذرائع موجود ہیں ان کا استعمال کیا جائے۔

یہ وہ بنیادی کام ہیں جن کو ذمہ داری سے ادا کیے بغیر ہم الحاد، مادیت، لادینیت اور دین و دنیا میں تفریق سے غیر توحیدی تصور کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے اقامت دین اور کلمۂ حق کے قیام کے عنوان سے قرآن کریم نے پکارا ہے اور جس کی ادائیگی کے لیے 'خیرِ اُمت' کو پیدا کیا ہے۔

ہمیں جو 'امت وسط' بنایا گیا ہے، اس کی وجہ ہماری نسل، رنگ، زبان نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف ہماری ذمہ داری دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے باب میں ہے۔ اس غرض کے لیے ہر کلمہ گو کو آگے بڑھ کر عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیم، معیشت، سیاست، ثقافت، ابلاغِ عامہ، ہر شعبۂ زندگی کی ان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں علم کی تدوینِ جدید اور بغیر دُنیاوی معاوضے کے، ایک صالح نظام معاشرت، معیشت و سیاست کے قیام کے لیے افرادِ کار کی تیاری کو ترجیحی بنیاد پر کرنا ہوگا۔ نوجوان ہمارا اصل اثاثہ ہیں۔ اگر یہ کام کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ۱۰ فی صد افراد جو دینی تعلیم سے آگاہ نہ ہونے کے سبب الحاد کا شکار ہو رہے ہیں، اور وہ افراد بھی جو دین کی لاعلمی کا شکار ہیں، انھیں قرآن پاک اور سیرت نبویؐ کے زیر سایہ لا کر پاکستان کے فعال، تعمیری اور متحرک افراد میں تبدیل نہ کیا جا سکے۔ اللہ ہمیں اقامت دین کی اس عظیم ذمہ داری کو احسن انداز میں سمجھ کر پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

نماز سے کردارسازی

نماز میں جو الفاظ ہم اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں ان کے معنی و مدعّا پر غور کریں، تو نماز کا لفظ لفظ ہمیں کچھ سکھا رہا ہے۔

آیئے! دیکھتے ہیں کیا سکھا رہا ہے؟ نماز کے یہ الفاظ ہمارے ضمیر کو کیسے بیدار کر رہے ہیں، کتنی خوب صورتی سے ہماری سیرت سازی کر رہے ہیں، کیسے وہ ہم جیسے انسانِ ضعیف کو ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں؟ نماز کیسے ہمیں بدی کے طوفانوں میں حق کی راہوں پر مضبوط جماتی ہے؟

نماز نہ صرف حق پر استقامت کا باعث بنتی ہے، بلکہ باطل کی سرکوبی کی طاقت بھی فراہم کرتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ:

- ہم نماز بے سوچے سمجھے نہ پڑھیں۔
- نماز کے الفاظ کے مدعّا کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے اور اپنے قلب و روح میں انھیں جذب کرتے جائیں ـــــ یہاں تک کہ:

یہ شعوری ایمان ہماری عملی زندگی کے تمام گوشوں کو صفاتِ حمیدہ سے مزین کر دے۔

حقیقت یہی ہے کہ نماز سے بڑھ کر کوئی طریقۂ تربیت مؤثر نہیں ہے جو روزانہ دن میں کئی کئی بار اُمت مسلمہ کے فرد فرد کی بیداری کا سامان کرتی ہے ؎

وہ سجدہ، روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

یاسمین حمید

(عطیۂ اشتہار: خیرخواہ) (نماز سے کردارسازی کیسے؟)

اسوۂ حسینؓ

خدا کے فضل سے آپ نئے سال کا آغاز کر رہے ہیں۔ پروردگار سے دُعا ہے کہ یہ سال عالمِ اسلام کے لیے عزّت و سربلندی، ترقی و خوش حالی، امن و آزادی اور خیر و برکت کا سال ہو.....!

اسلامی سال ماہِ محرم سے شروع ہوتا ہے۔ اس ماہ میں ایک ایسا تاریخی اور انقلابی سانحہ پیش آیا تھا جس کی یاد ہر سال مسلمانوں کو یہ سبق دیتی ہے کہ اصل زندگی خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینا ہے ـــــ یہی اسوۂ حسینؓ کا پیغام ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے اور خدا کی کتاب بھی یہی بتاتی ہے کہ زندہ رہنے اور زندوں کی طرح زندگی گزارنے کا حق صرف اسی کو ہے جو حق کی خاطر جان دینے کے لیے تیار ہے ـــــ اس قوم کے لیے موت ہی مقدر ہے جو موت سے لرزتی ہے۔

بنی اسرائیل ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب موت کے خوف سے وہ اپنے گھروں سے نکلے تو خدا نے ان کی قومی موت کا فیصلہ فرما دیا، اور پھر مسلسل چالیس سال تک وہ سرزمین میں اِدھر اُدھر زندگی سے محروم سرگرداں مارے مارے پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگل کی گود میں جب ان کی نئی نسل پل کر جوان ہوئی اور وہ موت سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہوئے تو خدا نے ان کو فتح و نصرت سے نواز دیا۔

یہ پوری داستان خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہے، اور مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اس داستانِ عبرت سے سبق لیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ عزّت و سربلندی کی زندگی یہی ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔

محمد یوسف اصلاحی

(شعورِ حیات)

(عطیۂ اشتہار: صوفی بابا)